ظ۔ انصاری

"........... میں نے جی کڑا کر کے ایک رات تہیہ کیا کہ اگر واقعی کوئی بڑا کریم و رحیم پروردگار ہے تو اس سے بات کر لی جائے۔ صبح کا سپیدا نمودار ہونے میں ابھی دیر تھی۔ محلّے کی اپنی پیاری مسجد میں پہنچا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگالی۔ محراب میں سر ٹیکا رقت طاری کی۔ سجدے کو اتنا طول دیا کہ نمازیوں نے دروازہ پیٹ پیٹ کر مجھے چونکا دیا۔ اٹھا۔ آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ بازگشت بھی نہ آئی۔ دو اگر بتیاں محراب میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں نکال لیں اور پکار کر کہا "لے، ہم تیری اگر بتیاں چرا کر لے جا رہے ہیں، اگر تو ہے اور بگڑی بنا نہیں سکتا تو کچھ بگاڑ کر دکھا............"

امّاں نے آواز دی: "بیٹے، پانی گرم ہوگیا ہے۔ چلو، میں نہلا دوں۔"

میں نے چڑ کر جواب دیا: "امّاں اب میں بڑا ہوگیا ہوں۔ خود نہا لوں گا۔ آپ بس کمرکل دیجیے!"

وہ ٹسنی ان سنی کر کے غسلخانے میں بارہ برس کے بڑے بیٹے کو نہلانے آئیں۔ نہلا چکیں تو سفید پاجامہ دیا پہننے کو۔ میں نے پہننا چاہا۔ اس میں شِکن پڑے ہوئے تھے۔ دُھلائی بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے پاجامہ چیر ڈالا اور کیچڑ میں پھینک کر چپ چپ کر دیا۔" اگر یہی پہننا ہے تو نہانے نہلانے کی ضرورت کیا! جاؤ، ہم ننگے پھریں گے!"

امّاں نے میری پیٹھ پر دو چیتڑ رسید کئے اور ایک کونے میں جا کر رونے بیٹھ گئیں۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی رہیں۔ ان دنوں وہ بہت رونے لگی تھیں۔ روتی اور بین کرتی جاتیں۔

... ہائے میرے اٹھارہ جوڑی کواڑ کا مکان،

... ہائے میرے ہاتھی سے جڑاؤ صندوق...

... ہائے یہ — ہائے وہ...

سوز اور مرثیہ بہت اچھا پڑھتی تھیں۔ دور دور سے بلاوے آتے۔ بڑے تام جھام سے سوز خوانی کے لئے جایا کرتیں۔ غم حسین سے انھوں نے صرف رونا پیٹنا ہی نہیں سیکھا تھا، ان کی فریاد میں لَے بھی ہوتی تھی۔

جب آئی گرمیوں میں ہم پانچ آدمی گھنٹہ گھر، میرٹھ کے باہر سوا چار روپے مہینے کرائے کے کچے مکان میں اُتارے گئے تو اس کا کھلا آنگن، نیچی دیواریں اور نیم کے پیڑ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایک تو مکان کی تبدیلی، پھر کچی مٹی کی سوندھی مہک، پھر درختوں کی چھاؤں۔ البتہ غم کی ہلکی سی لکیر بھی بے فکر سینے پر کھنچ گئی، نوکر اور نوکرانی دونوں غائب۔ برتنوں کے صندوق پہلے ہی کم ہو چکے تھے، شام کو دسترخوان نہیں بچھا۔ فانوس دار لالٹین نہیں جلی۔ مٹی کے تیل کی چیکٹ کپّی دھواں دیتی رہی اور میرے شاندار، کم سخن ابّا، شیروانی کے بٹن کھولے، گردن جھکائے، سالن کے پیالے میں لقمے ڈبوتے رہے۔ امّاں اُنھیں ڈانٹ رہی تھیں: سہارن پوری گنوار۔ پہلے سالن میں ہاتھ ڈبوئیں گے، پھر شوربا چاٹیں گے۔ پھر ڈکار لیں گے۔ توبہ ہے خدایا میری۔ جانگلوش سے واسطہ پڑا۔ تینوں بچے بھی یہی سیکھ رہے ہیں۔

ابّا نے کڑکڑاتے گھی اور شکر کے قوام والا پیالہ میری طرف سرکایا اور خود اُٹھ کر ہاتھ دھو لیے۔

دن گزرتے گئے۔ ہم بہن بھائی محلے کے بچوں سے نہیں ملتے تھے۔

.... دوسرے دن جمعہ تھا۔ مدرسے کی چھٹی کا دن۔ ایک عمر رسیدہ ہمسائی اندر جھانکی۔ اماں سے سلام دعا کی۔ ویسے تو وہ ان کم ذات عورتوں کو منہ نہ لگاتیں، مگر وقت دیکھ کر کچھ پسیج گئیں۔ قلم دوات دے کر مجھ سے کہا: "جاؤ میاں، ذرا ان کا خط لکھ آؤ۔ پتہ ٹھیک لکھنا۔"

اندر ایک قصباتی سی عورت، چاندی سونے کے زیوروں سے لدی ہوئی، گلفام، پھل پھول سے لدی ڈال کی طرح، ناک میں نتھ ڈالے، سجیلے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے وہیں پاس بٹھا لیا۔ کان میں کہا "ان کو خط لکھوانا ہے۔ جو بولوں، وہ لکھنا۔" وہ چپکے چپکے بولتی رہی۔ میں اسکول کی کاپی کے ورق پھاڑ کر لکھتا گیا۔ کئی ورق چل کر خط پورا ہونے میں آیا۔ سلام لکھنے سے پہلے میں نے موقع محل دیکھتے ہوئے فارسی کا ایک شعر بھی جڑ دیا ؎

گر صد ہزار لعل و گہری دہی، چہ سود
دل را شکستۂ، نہ کہ گوہر شکستۂ

اُن دنوں (فارسی میں) رقعات عالمگیری پڑھی تھی۔ کیا سادہ اور دل نشیں انداز تھا اورنگ زیب کی تحریروں کا۔ گلستانِ سعدی اور حضرت عبداللہ انصاری کے طرزِ بیان کے بعد یہی عالمگیری اندازِ تحریر مجھ پر چھا گیا تھا۔ ایک لفظ بھرتی کا نہیں، ایک آواز بے سُری نہیں۔ بس کام کی بات کہ قلم سے ٹپکے اور زبان زد ہو جائے۔ واہ!

(اورنگ زیب کو پرچہ لگا کہ مغل شہزادے نے اپنی سیّد زادی دُلہن کو ڈانٹا اور بُرے کلمے کہے۔ اس پر بوڑھے باپ نے بدمزاج بیٹے کو خط میں تنبیہ اور تنخواہ میں چھٹنی کی ہے۔ وہیں یہ شعر لکھا کہ برخوردار، اب لاکھ جڑاؤ موتیوں کے ہار بھی دو تو دل دُکھانے کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ دل توڑا ہے، موتی نہیں توڑے۔)

وہ نازنین کُرید کر پوچھنے لگی۔ تم نے کیا بڑھا دیا، مطلب بتاؤ۔ میں نے شعر پڑھا، مطلب بتایا۔ اس نے مجھے چھاتی سے بھینچ کر پیار کیا۔ اتنی خوشبو، اتنی گرمی اور نرمی تھی اس کے بدن میں کہ میرے پسینے چھوٹ گئے شرم کے مارے۔

چلتے وقت ماں بیٹی نے الگ الگ دو پیسے فیس کے میری ہتھیلی پر رکھے۔ فیس قرار پائی۔ پوسٹ کارڈ لکھائی ایک پیسہ، لفافہ دو پیسے۔ لمبا خط اور اچھا لکھو (مطلب یہ کہ شعر و یر بھی کھپ جائے) تو اوپر سے مٹھی بھر ریوڑیاں۔ لو صاحب، جمعہ کے جمعہ اس گھر کے دروازے پر گلی میں چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ پاس پڑوس کی عورتیں آگے پیچھے لائن لگا کر خط لکھوائیں۔ دھوپ اُترنے تک بیس پچیس کمائی ہونے لگی۔ تب تک مجھے معلوم نہ تھا کہ پاکٹ منی یا جیب خرچ جیسی کوئی چیز بھی ہوتی ہے۔ گھر میں آتا۔ اماں کے سامنے ساری جیب اُلٹ دیتا۔

موسم بدلا۔ سردیاں آگئیں۔ جمعہ کی صبح سے پہلے ہی بُلاوے آنے لگے۔ اس افلاس نگری میں ٹھیکیدار صاحب کے دو منزلہ پختہ مکان میں آمد و رفت شروع ہوگئی۔ اُن کی جوان لڑکیاں لحاف میں چھپ چھپ کر خط لکھوانے لگیں اور مٹھی بھر ریوڑیوں کی خاطر میں نے ایک سے ایک گرم اور کرارے شعر یاد کرنے اور لکھنے شروع کر دیئے۔

مجھ کم بختی مارے کو کیا خبر کہ ہرنیوں کی ڈار میں ایک، جو رازدارانہ خط لکھواتی ہے اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال ڈال کر کھلکھلاتی ہے، اِٹھلاتی ہے، وہ بیٹی نہیں، بڑے میاں کی نئی جورو ہے۔ ایک خط پکڑا گیا۔ لکھنے والے کی طلبی ہوئی۔ محلے ٹولے میں بدنامی کہ لڑکا ابھی سے .... پٹائی بھی ہوتی مگر منہ سے نہ پھوٹا کہ جناب، یہ خط میں نے اُسے نہیں، اُس نے اپنے کسی کو میرے قلم سے لکھوایا ہے۔ لڑکی نے آنسوؤں میں میرا ہاتھ کھینچ کر اسے زور سے چوم لیا اور اندر جا چھپی۔ آمد و رفت بند۔ جمعہ والی مستقل

آمدنی بند ہونے کو ہو گئی۔ مگر کوئی کسک سی، نامعلوم چبھن رہ گئی۔ برسوں بعد پتہ چلا کہ وہ فارسی کی عاشقانہ شاعری کا ان فیکشن جو قبل از وقت جذبۂ اُلفت سا جسے بدن کے خلیوں کی خوراک نہیں مل سکی اور وہ ٹیس گیا۔

تو یوں گویا مفلسی اور عاشقی، دونوں جاں گداز نشتر میری روح میں اس وقت پیوست ہوئے جب کھیلنے کھانے کے دن تھے، جب اُن نشتروں کو پلانے کے لئے جسم میں پورا لہو بھی نہیں تھا۔ مارچ کا مہینہ آیا تو صبح اور شام کی ہوا سے دل میں میٹھا میٹھا درد اُٹھنے لگا۔ میں پھٹے جوتوں کے باوجود چھاؤنی کی مال روڈ پر اور باغیچوں میں تنہا پھرتا اور اپنے ہم سبق بڑے بڑے لڑکوں سے کترا تا تھا۔ مظاہر اور مناظر پر خاموشی سے سوچنے کا چسکا بھی تبھی لگا۔ ایک صاحب، جو بعد میں کرنل کے فوجی عہدے پر پہنچے، آج تک مجھے اُنھی دنوں کے ایک جملے سے یاد رکھے ہوئے ہیں:

سامنے سے موٹر آرہی تھی۔ ہم دونوں خاموش ٹہل رہے تھے۔ بار برابر سے گزر گئی تو گرد و غبار منہ میں بھرا۔ میں نے کہا: دیکھئے..... صاحب، وہ جو ہوتی ہے نا سرمایہ داری، وہ ایسی ہوتی ہے کہ سامنے سے اتنی تیز روشنی، آنکھیں چُندھیا جائیں اور پیچھے کیچڑ مٹی۔ ہم راہگیروں کے لئے۔ سرمایہ داری "کا لفظ نیازؔ کے "نگار" کی راہ سے پہلی بار مجھ تک پہنچا تھا۔

☆

آپ بیتی لکھتے ہیں وہ لوگ جنھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو، بڑا نام پایا ہو۔ اپنے وقتوں کے سورما رہے ہوں یا سورماؤں میں رہے ہوں۔ برٹرینڈ رسل ہوں، چرچل ہوں، فرینک ہارلیس یا ایلیا اہرن برگ، یا جوشؔ ملیح آبادی ہوں۔ ہم کون! ادنادرجے کی اوقات، اوسط درجے کے کام۔ واقعات کی کھتونی کھول کے بیٹھیں اور کوئی پوچھے کہ "بھیّا کیسی؟" تو اپنے گریبان پر گردن ہار ہو جائے۔ کوئی بڑا تیر مارتے تو تیر گروں کے لئے اپنی آپ بیتی کا ہایت نامہ چھوڑ جاتے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ سیدھے بھلے اپنے معمول پن کی نمائش کر دیں اور (خدانخواستہ) بڑے بوڑھوں کی طرح، پچھلا چارے کی جگالی جلدی سے بند کر دیں۔ کسی نہ کسی کو تو اس منظر سے لطف ضرور آئے گا۔

دراصل بات یہ ہے کہ ابھی "آپ بیتی" لکھنے کے رُتبہ اور وقت کو نہیں پہنچے ہیں ہم۔ ایرگنی پوتی شینکو ۲۴ برس کی عمر میں کچی آپ بیتی لکھ ڈالی تو وجہ یہ کہ مغرب میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی تھی۔ یا تو آدمی اتنی شہرت کے طلسم میں گرفتار ہو چکا ہو یا پھر اتنا بوڑھا کہ آئندہ کے لئے گزشتہ کی صرف یادیں بچی ہوں۔ ہمارے دشمن ہوں بوڑھے۔ ہم کیوں بوڑھے ہونے لگے! وہ دن آنے سے پہلے، ہم تو جام چھلکا کے، تلچھٹ چھوڑ کے، یہ جا، وہ جا۔

☆

میں نے پوچھا: اماں، یہ جو ہمارے نانا ہیں۔ یہ ہمیں پیار کیوں نہیں کرتے؟

جواب ملا: سُنّی ہیں وہ۔ تمہارے نانا مر گئے۔ یہ ان کے بھائی ہیں۔ ہمارے بھائیوں کو بھی انھوں نے سُنّی خارج کر لیا!"
ابا کے آبائی مکان سے ملا ہوا ایک اور رشتہ دار مکان تھا۔ اس میں ایک مونچھوں والے کالے سے کوئی صاحب رہتے تھے۔ ہم بھائی بہنوں کو دیکھتے ہی گود میں اُٹھا لیتے تھے۔ بڑی شفقت کرتے۔ میں نے بہت کریدا۔ پتہ نہیں چلا۔ ایک زمانے کے خاندان کے باہمی ناچاقی

کی بھنک کان میں پڑی تو ماز کھلا کر وہ ایک ہی دادا کی اولاد تھے ۔ مگر سُنّی ۔ بڑے و لیسے شُنّی ۔ چھی چھی! پھوپی مجھے ان سے زیادہ پیاری تھیں. سہارن پور کے اجڑے قصبے "نانوتہ" میں رہتی تھیں ۔ رام پور ، نانوتہ ، تھانہ بھون ، جلال آباد ، کاندھلہ کیرانہ ، یہ مسلم زمینداروں کی گڑھیاں تھیں جمنا کے کنارے کنارے ۔ کبھی انھوں نے سرحدی چھاؤنیوں کا کام کیا ہوگا. پنجاب کی سرکشی (سکھ خالصہ تحریک) اور فوجی یلغار کا نشانہ بنتی رہیں. نانوتہ تو سرہند کی طرح اینٹ مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گیا. خون اور خاندان کی حفاظت کرنے والے چند سیّد زادے اور پیر زادے اب تک وہیں پڑے تھے. ساہوکاروں کے مقروض ، علم اور حوصلہ سے معذور ۔ انھی میں سے ایک معزز سیّد خاندان میں میری پھوپی بیاہی گئیں . بیوگی کی پہاڑ سی زندگی انھوں نے کچھ بھائی کی مدد سے ، کچھ اپنے سگھڑ پنے سے عزت آبرو کے ساتھ بسر کی اور پانچ بچّے پال کر بڑے کر دیئے ۔ مجھے اپنی ددھیال کا سیدھا سچّا گنوار پن ، کھُردرا لہجہ ، بے تحاشا پیار ، بھونڈے اطوار ، ٹوٹے پھوٹے کھنڈر مکان ، اپنی ننھیال کے نستعلیق طور طریقوں سے ، بریلی اور لکھنؤ کے شہری رکھ رکھاؤ سے ، نمائشی سلیقے سے کہیں زیادہ پسند تھے ۔ بالغ ہونے سے پہلے ہی میرے رشتے کی بات دونوں سمتوں میں پکّی ہو چکی تھی. جنگی پر دادا کے سلسلے کا پہلا بیٹا تھا. ننھیال والوں سے زیادہ ددھیال والوں کو اپنی نسل چلنے کی فکر لگی ہوئی تھی.

پہلی بار گھر (میرٹھ) سے نکلا تو بلا ٹکٹ اور بگٹٹ اسی طرف پہنچا ۔ سادات کے محلّے میں تب تک کوئی دسویں پاس نہ تھا ۔ صرف شیخوں میں ایک تعلیم یافتہ جیالے بزرگ تھے. جن کے گھر میں علمی ادبی کتابوں کی ایک الماری اور الماری میں اقبال کی بانگ درا" نکلی. لے آیا. راتوں رات پڑھ کر تیسرے دن واپس کرنے گیا تو شیخ صاحب نے پوچھا: کہو ، برخوردار ، کیا سمجھے ؟" نام بڑا اور درشن تھوڑے ۔ ان سے زیادہ تو جوشؔ ملیح آبادی پسند ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اقبال کی مارسیت پر دھاوا بول دیا.

" جوشؔ تو شیعہ ہے ، تم بھی کچّے رافضی نکلو گے ۔" تب تک میرے مونچھیں نہیں نکلی تھیں ۔ صرف رواں سا آیا تھا. مجھے ایک تو اجنبی ملاقاتی کی زبان سے لفظ "برخوردار" بُرا لگا کہ ایسے نوجوان کو . جو فارسی شاعری کا سارا خوان چٹ کر چکا ہو ، یہ اقبال کی فارسی سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ بات شاعری کی اور معیار سنّی شیعہ کا ! لاحول ولا قوۃ !

اونچے نیچے ٹیلوں میں ، ملبے سے اٹھائی ہوئی دیواروں اور چونے کے پلستر سے جوڑے ہوئے صرف چند مکان سلامت رہ گئے تھے ۔ وہیں چھتے کے باہر آمنے سامنے دو تخت پڑے تھے جن پر اس اُجاڑ قصبے کے پانچ سات معززین اُلتی پالتی مار کر حقّہ گڑگڑایا کرتے تھے .

عصر کی نماز ہو چکی ہے. محرّم کا مہینہ ہے ۔ حقّہ تازہ ہو کر ابھی آیا نہیں. میر صاحب زوّار تھانیدار سادہ سوگوار لباس میں ایک مونڈھے پر براجمان ہیں. بار بار پہلو بدل رہے ہیں. ان کے پیشِ خدمت مخنی سے میر صاحب چلم سلگا رہے ہیں کہ اتنے میں میلے مطروح کا ڈھے میں لپٹا ہوا بچی عمر کا ایک قصباتی مسلمان تخت کے پاس سے ٹھٹکے بغیر گزرا. گزرتے میں اس نے بآواز بلند کہا. "السلام علیکم" اور گزر گیا ۔ میر صاحب نے گردن موڑے بغیر ترچھی نظر سے اسے دیکھا . پھر مجھے کچھ اشارہ کیا . میں نہیں سمجھا. پھر خود لے پکارا. "ادھر آ بے تو بے!" وہ اسی شان سے تنا ہوا واپس آیا ۔ میر صاحب اتنے میں اپنا بوٹ پاؤں سے نکال چکے تھے. ایک ہاتھ میں اس کا گریبان اور دوسرے ہاتھ میں بوٹ کا منہ ۔ دے تڑا تڑ ۔ "ابے جُلاہے ۔ چار پیسے پلّے میں آ گئے تو یوں

اکڑ کے چلتا ہے؟ نہ آداب عرض، نہ تسلیمات، نہ حضور، نہ سرکار، پتھر سا مار دیا۔ السّلام علیکم! اس گھر کے ادب آداب تم کینوں کے ہاتھوں یوں خاک میں ملتے دیکھیں گے ہم؟" میر صاحب غصّے میں لال انگارہ ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ادھر سے شیخ صاحب گھوڑی پر سوار آپہنچے۔ "جانے دیجئے۔ غصّہ تھوکیے تھانیدار صاحب۔ چھوٹے آدمیوں کا زمانہ آرہا ہے اب۔ ہمارے آپ کے دن گئے۔" "کہیں نہیں گئے دن جی۔ آپ وہابیوں نے ان لوگوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔ ان کی آنکھ کا پانی مر گیا ہے ورنہ کیا مجال تھی کہ ہمارے سامنے یہ پلنگ پر بیٹھ جائیں۔ آپ اسلام کے نام پہ انھیں ساتھ اُٹھاتے بٹھاتے ہیں۔ آج ہم سہیں گے تو کل آپ وہابی حضرات کو بھی سہنا پڑے گا!" میری ڈکشنری میں "وہابی" کا لفظ موٹے حرفوں سے لکھا گیا۔ اور مہینہ بھر بعد جب میں میرٹھ واپس آیا تو آتے ہی میں نے وہابیوں کے مشہور عالم مولوی عاشق الٰہی کے اُٹنگے پاجامے والے لڑکوں سے میل جول شروع کر دیا۔ ایک دن تو انھی کی مسجد میں نماز پڑھی ہاتھ باندھ کر۔ مگر نماز آدھی تیتر آدھی بٹیر ہو گئی ہو گی کیونکہ مسجد کے موذّن نے لمبی داڑھی کھجا کر درشت لہجے میں بتایا "نماز سیکھو، ایسے نہیں ہوتی ہے۔ مقبول نہیں ہو گی۔"

۴

ہماری نوعمری میں لڑکیاں نہیں ہوا کرتی تھیں، بہو بیٹیاں ہوتی تھیں۔ اور اُن کو ہم نے جھکی ہوئی نظروں سے دیکھنا سیکھا تھا۔ گلی سے باہر پختہ مکانوں میں ایک صاف ستھرا کنبہ آکر رہا جس میں میرے ہم عمر لطافت، فصاحت یا نفاست نام کے دو تین خوش منظر گورے چٹے لڑکے بھی تھے۔ شوق اور استفسار سے میں نے معلوم کر لیا کہ کون کب اسکول جاتا ہے، کس وقت آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ جس دن ملاقات نہ ہوتی، دن اُداس گزرتا۔ ہجر و وصال کے اشعار ہجوم کرتے۔ عربی کے خشک علم فقہ، حدیث و تفسیر، منطق و فلسفے کے طالب علم پر، جو عنقریب "فاضل" کا آخری امتحان دینے والا تھا، فارسی شاعری اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ ایک روز ان کے گھر تین پھیرے کئے۔ تیسرے پھیرے میں ایک شعر لکھ کر بیٹھک میں ڈال آیا۔ ؎

دلا سیلابِ خوں را از شگافِ سینہ بیروں کن
کہ امشب سودہ ام بر دیدہ خاکِ آستانے را

نظیری نیشا پوری (آف احمد آباد) کا شعر ہے۔ پوری غزل جان لیوا۔ وہ پُرزہ باپ کے ہاتھ لگا۔ خوش ذوق آدمی تھے۔ بھانپ گئے۔ میرے ہمدرد اور ہمراز بن گئے۔ نئی نئی کتابیں دینے لگے۔ انھی میں دو کتابیں تھیں "آریہ مسافر" کی تھیں۔ سلیس زبان میں حق کی تلاش اور نیم فلسفیانہ مسائل کا بیان۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مصنّف پنڈت سدرشن تھے)۔ بڑا مزا آیا۔ فکر کو نئی چاشنی ملی۔ آریہ سماجیوں کے سماروہ میں شوق سے جانے لگا۔ درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ اور جوشیلے مجمع میں اکثر مسٹر جناّ کا نام آتا۔ ان کے بیانات خصوصاً دو قومی نظریے کی نکتہ چینی پر سنائی دینے لگی۔

ایک معمول سا بن گیا تھا کہ سالانہ امتحان آنے سے ذرا پہلے میری کورس کی کتابیں یکے بعد دیگرے کھوئی جاتی تھیں اور امتحان ختم ہونے کے بعد، نمازی، پرہیزگار نکھٹو لڑکے (جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے) گم شدہ کتابوں کا اتہ پتہ بتا دیا

کرتے تھے۔ اس کارِ خیر کے عوض مجھے نوچندی جمعرات پر مٹھائی منگا کر بانٹنی پڑتی تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اس قماش کے لڑکے مسلم لیگ کی حمایت کر لے اور صاف کہنے لگے کہ ایک آریہ سماجی نام نہاد مولوی کا مال حلال ہے۔ مالِ موذی نصیبِ غازی۔

ٹاؤن ہال کے لان پر کمیں کے جھنڈے اور لاؤڈ اسپیکر لگے دیکھے تو میں رک گیا۔ ایسا پہلے کئی بار ہوا تھا۔ شام پڑے وہاں جمِ غفیر ہو گیا۔ مجلس احرار، جمیتہ العلما اور کانگریس کے ہم خیال مسلمانوں میں بڑا جوش تھا۔ نمایاں ہونے کی کوشش میں اسٹیج کے ایک سرے پر (جان پہچان والوں کی مدد سے) میں بھی جم گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بلند قامت، موٹے تازے، عبا قبا والے مولوی صاحب اسٹیج پر گویا آسمان سے اُترے۔ مختصر استقبالیہ تقریروں کے بعد جیسے ہی انھوں نے بلند آواز سے کہا: بھائیو، اور ایک کے سوا باقی میری بہنو!.... آج میں دیکھ رہا ہوں کہ شاید مسلم لیگیوں کی شہ پر پولیس والوں کی پوری پلٹن بھی یہاں...... کہ اشرف بیرسٹر کی قیادت میں پہلوانوں کا ایک گروہ اسٹیج پر حملہ آور ہوا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری چلے جاؤ۔ عطاء اللہ شاہ بخاری، نہیں سُنیں گے، مسلم لیگ زندہ باد۔ ایسی ریلا پیل ہوئی کہ میں اپنے پرانے جوتے چھوڑ کر بھاگا۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ ابا جاگ رہے تھے۔ بے چین تھے۔

"جوتے کہاں ہیں؟"

"کھو گئے، وہاں ٹاؤن ہال میں"

"وہاں رات کو کیا کر رہے تھے؟"

انھوں نے واقعی چاندی کی موٹھ والی چھڑی گھما کر میری پیٹھ پر رسید کر دی۔ اور پھر آنکھوں پر رومال رکھ کر اندھیرے میں ہو گئے۔ اس گھر میں چاندی کی یہ آخری شے تھی جو میں نے سال بھر بعد رات کی تاریکی میں کسی مہاجن کے ہاتھ بیچی اور فاقہ شکنی کا انتظام کیا۔

مجھے غم سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ ٹاؤن ہال کے لان پر جلسے کی اصل تقریر در و دیوار سے ٹکرا کر باجے کی طرح بجنے لگی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کوئی تین چار گھنٹے بڑے مزے میں بولتے رہے۔ کبھی مولانا روم کے شعر لہک کر پڑھتے، کبھی آیات و احادیث، کبھی وارث شاہ کی ہیر۔ کبھی بھڑک اُٹھتے: ارے کون ہے تمہارا لیڈر؟ اس سے پوچھو، ختنہ بھی ہوئی اُس کی؟ جس کی سنّتیں نہ ہوئی ہوں وہ سنّتِ نبوی کو کیا جانے گا۔ سنو، مہاتما گاندھی نے کہا، بھائی جینا، پہلے انگریز سے نپٹ لیں۔ پھر.....

میں ایک ایک لفظ اپنے حافظے میں چُنتا گیا۔ نیند سے بوجھل پپوٹوں میں وہ تقریر میں نے ریکارڈ کی طرح بھر لی اور دوسرے دن نوجوان اور پختہ عمر ہم جماعت مولویوں کو جا کر صاف جتا دیا کہ کانگریس ہندوستان کی آزادی کی مجاہد ہے اور اب سے ہم کھدّر پہنیں گے (آریہ مسافر نے گوشت خوری پہلے ہی ترک کرا دی تھی) اور کانگریس کے لئے کام کریں گے۔ ایک مولوی ہادی حسن (اسی عربی کالج کے ٹیچر مہدی حسن کا لڑکا) جس سے میری لڑائی تھی، بڑھ چڑھ کر مذاق اُڑانے لگا۔ ہی ہی ہی۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ہادی حسن کے والد کا انتقال ہو گیا اور بیٹے نے باپ کی جگہ کے لئے درخواست دی۔ درخواست نامنظور ہوئی تو میں نے گھر گھر جا کر بڑے لڑکوں کو اشتعال دلایا کہ بیٹا باپ سے زیادہ سند یافتہ ہے۔ یہ جگہ اُسے نہ ملی تو ہم ہڑتال کر دیں گے۔ انصاف! انصاف!

پہلی بار میں نے اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ کر ایک جوشیلی تقریر کی۔ اور سالانہ سرکاری امتحان سے ہفتہ بھر پہلے ہڑتال ہوگئی تلے پڑ گئے۔

آج بھی یاد کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ دادا جان مرحوم کی یہ بڑی لاٹھی اُٹھائے، بال بڑھائے، کھدر کا کُرتا پاجامہ پہنے، میں آگے آگے، اور مجھ سے بلے لڑکے پیچھے پیچھے۔ جلوس نکلا۔ جج صاحب (ٹرسٹی) کی کوٹھی پر پہنچا۔ ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار نے انٹرویو لیا۔ ایک بزرگ نے روک کر لاٹھی چھینی اور غالب کے لفظوں میں پھبتی کسی:

اے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند؟

ہادی حسن کی درخواست منظور رہوئی۔ ہڑتالیوں کے کئی مطالبے (مثلاً یہ کہ انگریزی کی دسویں کلاس بھی سپہر سے کھولی جائے) مانے گئے۔ اور امتحان ختم ہوتے ہی پتہ چلا کہ میرا دو مہینے کا وظیفہ سوخت ہوگیا۔ رجسٹر میں غالباً دو مہینے کی غیر حاضری لگا دی تھی اللہ رسول کے سخت گیر منشیوں نے۔

یوروپ میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ اناج مہنگا ہو چلا تھا۔ وظیفہ قابلیت بند ہونے کے سبب گھر میں فاقے ہونے لگے۔ میں نے قرض اُدھار کرکے سوا دو روپے کا ایک نیا جوتا بنوایا، ساڑھے سولہ روپے کی پرانی سائیکل خریدی۔ میرٹھ کالج ہاسٹل میں فارسی کے دو ٹیوشن مل گئے۔ ایک انٹر کا، ایک بی۔ اے کا۔ خود انگریزی پڑھنے اور جیشوری، موسیٰ بن علی اور سکسینہ کو پڑھانے جانے لگا۔ دونوں گردپ چھ چھ روپے مہینے دیتے تھے۔ کبھی دیتے، کبھی بھول جاتے۔ وہ رئیس زادے تھے۔ ہم بگڑے رئیس۔ تقاضے کی ہمت نہ پڑتی اور گھر پہنچ کر سات بھوکے چہرے دیکھنے پڑتے۔ ایک روز نہیں جا سکا۔ زبردست جلوس دیکھنے میں لگ گیا۔ آگے موٹر کار پر مسٹر جناح جو تبھی قائدِ اعظم بنے تھے۔ ان کے بعد ہاتھی پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سے ڈاکٹر اببیڈ کر۔ اونٹ، گھوڑے، باجے گاجے۔ زاہدیوں نے زوردار استقبال کیا اور بینر پر یہ شعر لگایا:

وراثت میں پہنچا ہے حقِ سیاست
محمد علی سے محمد علی کو

یعنی مولانا محمد علی جوہر سے محمد علی جناح کو۔ جلوس میں ہلّا بہت تھا۔ کانگریسیوں کے جلوسوں کی سی تنظیم نہ تھی۔ اب تو میں بالکل ہی کانگریسی ہوگیا۔ مزاج میں عربی والوں کی خشونت اور سخت گیری کچھ نہ کچھ تو سمائی ہوئی تھی۔ اپنے عزیزوں سے بھی بگڑائی چلی گئی۔

محرم کی خاص مجلس پڑھنے کے لئے باہر سے کوئی بڑے مجتہد آئے ہوئے تھے۔ وہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور میں نے نیچے سے ایک رقعہ تہ کیا ہوا اُن کی طرف بڑھا دیا۔ عربی میں لکھا تھا (تاکہ عام اہل ایمان کی گرفت میں نہ آئے) کہ دسہرے اور عاشورے میں، دونوں کی رسموں میں، تعزیہ داری اور مندروں کی آرائش میں ..... وغیرہ وغیرہ میں اگر کوئی مشابہت ہے تو پھر واقعۂ کربلا نے سچی توحید کا پیغام کیسے پہنچایا؟ یہ اور ایسے ہی کئی دلآزار سوال تھے۔ جن کا برسر منبر جواب چاہا تھا۔

جواب انھوں نے دیا۔ اور پوچھا کس کے سوالات ہیں؟ میں نے ہاتھ اُٹھا کر ہامی بھرنے کا انجام سوچ لیا تھا۔ انجام اُسی دن سامنے آیا محلّے میں سلامتی سے گزرنا دشوار ہوگیا۔ لیکن اس سے زیادہ دشوار تھا یہ طے کرنا کہ صاحبزادے وہابی ہو گئے ہیں یا آریہ سماجی؟ پڑھ لکھ کے ڈبو دیا۔

اِنھی دنوں برطانوی حکومتِ ہند کی جنگی پالیسی کے خلاف گاندھی جی کی انفرادی ستیہ گرہ چل رہی تھی۔ میں نے ستیہ گرہیوں کے ڈلیوں کو دیکھا۔ ان کے صبر و ضبط کا اثر لیا۔ ڈاکٹر صادق کمبو اور مقصود زاہدی میں ایک میرے سیاسی فلاسفر بنے۔ دوسرے ادبی بڑے بھائی۔ دونوں کا قومی سیاسی حلقوں میں آنا جانا تھا۔ بعض مکانوں میں ہم گئے جو بالکل قلعہ بند تھے۔ آنگن چھوٹے اور اُن کے اوپر لوہے کے جنگلے۔ کبوہ دروازے سے تحصیل سی پٹ بازار کو جاتے ہوئے آدھا شہر طے ہوجاتا۔ اس پختہ آدھے شہر میں کہیں ایک آدھ مسلمان کا گھر تھا۔ درمیان میں کہیں کوئی مسجدِ ویران۔ اور چاروں طرف اونچے اونچے مکان۔ بعضوں میں ڈیوڑھی پر گائے بندھی ہوتی۔ اندر قدم رکھتے ہی ظاہر و باطن دونوں میں اونچی نیچی دیواریں کھڑی ہوتی۔ پیاس لگے تو گلاس اور کٹورے کی دیوار۔ چین سے بیٹھنا چاہیں تو گھٹے ہوئے کمروں کو کٹریوں کی قید۔ ہندو جوائنٹ فیملی کا چلن تو تھا ہی، فیملی بڑھنے کے ساتھ ساتھ مکانوں کے کمرے اور چوبارے بڑھتے بڑھتے ساری دھوپ اور ہوا روک لیتے۔ پھر ایک طرف میرے کئی دلیش اور سناتنی دوست، بزرگ یا شاگرد، اور دوسری طرف یہ نیا حلقہ آریہ ساجیوں، کانگریسیوں کا، جو رفتہ رفتہ چھوت چھات سے تو نکل رہا تھا لیکن عقیدے کی شدت اور اپنی راست بازی کے جوش نے بے لوچ دیوار کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ ہندو دہابی تھے۔

بھولوں گا نہیں کہ میں عجب کشمکش میں مبتلا رہا۔ خیالات ان لوگوں سے میل کھاتے تھے۔ دل ان سے ملنے کو چاہتا تھا .... مگر کچھ تو نشست و برخاست کے آداب میں اور کچھ حد بندیوں اور پابندیوں کی کثرت میں درمیانی طبقے کے اس ہندو ماحول سے گھٹن ہوتی تھی۔ میری حالت ان ویران مسجدوں کی سی ہوکر رہ گئی جو یاد دلاتی تھیں کہ یہ محلے، یہ حویلیاں اور باڑے کبھی خوشحال مسلمانوں کی ملکیت ہوں گے۔ انھوں نے خوش باشی، بےفکری اور غفلت میں اڑا دیئے۔ اب اُن کی اولاد شہر کے باہر پوربوں اور کچے مکانوں میں پڑی اناج کی بوریاں ڈھو رہی ہے۔ اور نئے خریدار اس اناج کی کھڑی فصلیں خرید رہے ہیں۔ صرّافے اور بزازے چلا رہے ہیں، مِل اور فیکٹری چلا رہے ہیں اور قومی آزادی کی خاطر چرخہ اور اندولن چلا رہے ہیں۔ جو خود چلے گا وہی چلائے گا بھی۔ سماج کی طبقاتی تقسیم کا فلسفہ تو کئی سال بعد پڑھنے کو ملا۔ آنکھوں نے اور سوچ نے اس کے بنیادی باب پہلے ہی دکھا دیئے تھے۔

۴

مکر اور جھوٹ سے طبیعت کو سخت نفرت تھی اور اب دیکھا کہ رفتہ رفتہ مکر اور جھوٹ روز کی عادت بننے لگے۔ پیٹ خالی ہے، مگر دوسرے کے گھر بہانہ کر رہے ہیں کہ رات پلاؤ زیادہ کھا لیا تھا۔ ہاضمہ خراب ہے۔ کچھ کھائیں گے نہیں۔ باپ نے ہونہار بیٹے کو اپنی نایاب اور قیمتی جیبی گھڑی تحفے میں دی۔ ایک خوبصورت سے لڑکے نے پوچھا ہمیں ایک دن کو دے دو گے؟ کہا۔ ایک دن نہیں، ایک مہینے کو لے لو۔ ہمارے گھر میں تو ایسی کئی کئی گھڑیاں رکھی ہیں۔ دن میں کئی کئی جھوٹ گڑھنے لگا۔ تخیل کو بڑی راحت ملتی ہے ایسی باتوں سے۔ نماز گنڈے دار ہو چلی تھی۔ کسی کا ساتھ ہوا تو گئے، پڑھ آئے۔

باپ صبح چار بجے اُٹھتے، صبح یک نمازیں اور مناجاتیں پڑھے جاتے۔

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

میں نے جی کڑا کر کے ایک رات تہیہ کیا کہ اگر واقعی کوئی بڑا کریم و رحیم پروردگار ہے تو اس سے بات کر لی جائے۔ صبح کا پیدا نمودار ہونے میں ابھی دیر تھی کہ محلے کی اپنی پیاری سی مسجد میں پہنچا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگالی۔ محراب میں سر ٹیکا۔ رقت طاری کی۔ سجدے کو اتنا طول دیا کہ نمازیوں نے دروازہ پیٹ پیٹ کر مجھے چونکا دیا۔ اٹھا۔ آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ بازگشت بھی نہ آئی۔ دو اگربتیاں محراب میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں نکال لیں۔ اور پکار کر کہا:

"لے، ہم تیری اگربتیاں چرا کر لے جا رہے ہیں۔ اگر تو ہے اور بگڑی بنا نہیں سکتا تو کچھ بگاڑ کر دکھا!"

یہ میری پہلی چوری تھی۔ صبح سویرے، خدا کے گھر میں خدا کے مال پہ ہاتھ صاف کیا اور پھر کئی بار کی مشق میں ہاتھ بالکل صاف ہو گیا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دل صاف نہیں رہتا۔ دھبہ سا رہ جاتا ہے۔

انھی حلقوں میں ایک کھدر پوش تنومند جوان آدمی ملے: "سونڈھی" کہلاتے تھے۔ دیکھنے میں کانگریسی لیکن بات کرو تو گاندھی جی اور ان کے اندولن کے سخت دشمن۔ "دس نو کسی بنیا" سے شروع ہوتے۔ ایک ہفتہ وار انقلابی اخبار نکالتے "کیرتی لہر" نام کا۔ اخبار کے دفتر گیا۔ دیکھا کہ خود مضمون لکھتے ہیں۔ خود کاپی جاتے ہیں اور کوئی مددگار نہ ہو تو خود ہی مشین چلا کر چھاپتے بھی ہیں۔ تھوڑے دن ان کے ساتھ کام کیا۔ صبح پڑھنے جاتا، دوپہر کو ان کا ہاتھ بٹاتا۔ تیسرے پہر سے پڑھانے کی پھیری پر نکلتا۔ شام کے بعد کہیں سیاسی یا ادبی بیٹھک جمتی۔ رات گئے گھر لوٹتا۔ اب چونکہ سات آدمی کے کنبے کی روٹی روزی کا سہارا تھا، چاہے کچھ کرو کوئی نہیں ٹوکتا تھا۔ کامریڈ سونڈھی کمیونسٹ انقلابی تحریک کے جانباز کارکن تھے۔ انھی کی بدولت مجھے کارل مارکس، اینگلس، پلیخانوف کی تحریریں (اردو میں) پڑھنے کو ملیں۔ باری علیگ کے اشتراکی کتابچے اور "کمپنی کی حکومت" ہاتھ آئی۔ سچ یہ ہے کہ ایک نئی سلطنت ہاتھ آئی۔ اور میں نے طے کیا کہ گھر بار سے بے نیاز ہو کر شہر سے باہر نکلا جائے۔ جیب کترنے اور کپڑا کاٹنے کی قینچی سے میں اپنی مونچھیں اور زبان کی قینچی سے بڑوں کے کان کترنے لگا تھا۔ خواہ مخواہ بڑا بننے کو میں نے بلا ضرورت ایک نازک سا چشمہ بھی ناک پر دھر لیا۔

دہلی سے کوئی سو کلو میٹر پر خورجہ مغربی یوپی میں پٹھانوں کا خاص قصبہ ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے سے چار پانچ خان بہادر، کوئی چالیس انسپکٹر آف پولیس، کئی ایس، پی اور آئی سی ایس اٹھے۔ اسے میں نے اپنے اگلے منصوبے کے لئے چُنا۔

نیک دل کرسی نشین رئیس حسین علی خان نے بڑا سا مکان مع فرنیچر حوالے کیا۔ نئی وضع کا اسکول کھلا۔ علی گڑھ کے چند مخلص نوجوان اپنے وطن میں گرمی کی چھٹیاں گزارنے آئے تو اسکول کی تحریک آگے بڑھی۔ کُل وقتی، جُز وقتی ٹیچر رکھے۔ کام یوں چلتا تھا کہ دو سائن بورڈوں کی ضرورت پڑی تو رات کو نکلے اور دو دکانوں کی چھت پر چڑھ کر تار کاٹے، بورڈ اتارے، صبح نیا رنگ و روغن کیا۔ نام لکھا، دوسرے دن لگا دیئے۔ "کچھ بگاڑ کر دکھا!"

چار بورڈنڈر تھے۔ اُن کے ناشتے کے لئے پیسے پورے نہیں پڑتے۔ انھیں لالہ جی کی دوکان پر لے گئے۔ کھلایا پلایا۔ چلتے وقت ایک تیس مار خاں کو آگے کر دیا جو اپنے کوٹ کے اندر تیزابی ڈنڈا لٹکائے پھرتے تھے۔ اپنے وقت کے دون کوئی کزوٹ (دان کی خوت) تھے ہر ایک کی خاطر مرنے مارنے پر کربستہ۔ اور ہماری خاطر تو ـ بس! یہاں آس پاس کے مقامات سے کئی پختہ کار طالب علم آپہنچے۔ ان میں ایک جینتی لال این بھی تھے۔ اُردو فارسی ادب کے رسیا۔ انھوں نے خبر دی کہ آپ جو صبح سویرے ریلوے لائن کے پار جایا کرتے ہیں تو خفیہ پولیس آپ پر نظر رکھتی ہے۔ ہوشیار رہیئے۔ ابھی ہوشیاری کی نوبت نہ آئی تھی کہ بمبئی سے گاندھی جی نے کوئٹ انڈیا کا (۸ اگست ۱۹۴۲ء کو) نعرہ لگا دیا۔ رات رات میں گرفتاریاں۔ ہر طرف بھاگ دوڑ ہاہاکار۔ ایک ظفر خان تھے جنم کے گئے۔ کھدر پوش۔ بظاہر میرے ہمدرد، بباطن پٹھانوں کو سونگھنے پر مامور۔ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے نکال لیا کہ اس تحریک کے شورش پسندوں سے رابطہ رکھتا ہوں۔ ایک روز تیسرے پہر کو میں اسی مکان کے دروازے بند کئے اندرونی کمرے میں تین سینئر طلبا کو خاقانی کا سنگلاخ قصیدہ پڑھا رہا تھا۔ (ارادہ تھا کہ اس کے بعد غائب ہو جاؤں گا۔)

صبحدم چوں کِلّہ بندد آہِ دود آسائے من
چوں شفق در خوں نشیند چشمِ شب پیمائے من

کچھ آہٹ سی ہوئی۔ پھر سناٹا۔ میں پڑھاتا رہا۔ تھک گیا تو میں نے کہا: دیکھو بھائی جینتی لال، اب معلوم نہیں کہاں ملیں۔ یہ بتاؤ تم تینوں کو اطلاع کیوں کر دوں۔

جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ ایک ہیڈ کانسٹبل (خفیہ) اور دو وردی والے داخل ہوئے۔ ہیڈ کوئی پُرانا خاندانی مسلمان تھا۔ کہنے لگا کہ ہم لوگ دیر سے باہر ٹھہرے آپ کی آواز سن رہے تھے۔ میں نے بڑے استادوں سے فارسی پڑھی ہے۔ مگر واہ.... جی چاہا کہ جب تک آپ پڑھاتے رہیں، میں سنتا جاؤں۔ اسی لئے ہم رُکے رہے۔

اسے واقعی میرے بچاؤ کی فکر پڑ گئی۔ بتانے لگا کہ کوتوالی میں دہلی سے ایس پی اور ڈی آئی جی آئے ہیں۔ تین آدمیوں کے نام ہیں گرفتاری کے لئے۔ آپ تیسرے ہیں۔ مگر میری مانیں تو بچ سکتے ہیں۔ جب میں اندر لے جا کر پیش کر دوں گا تو گول کھمبے کی آڑ میں کھڑا رہوں گا۔ ان کے سوالوں کا جواب دیتے وقت آپ میرا اشارہ سمجھ لیجئے گا۔ میرا ذمّہ، صاف بچا لوں گا۔

گول کھمبا: جی سرکار۔ یہ ہیں وہ۔ پورا نام نہیں بتاتے۔

سوال: یہ کیا نام ہوتا ہے۔ ظ انصاری

جواب: آپ صاحبان یہاں نام درست کرنے آئے ہیں کیا۔؟

سوال: آپ لوگوں نے یہاں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔

جواب: فتنہ تو ۸ اگست سے برپا ہے جب قومی رہنماؤں کو غیر ملکی حکومت نے مجرمانہ گرفتار کیا۔

گول کھمبے کی آڑ: نہیں، نہیں۔

سوال: آپ چند لڑکوں نے کل کے لئے کوئی خلافِ قانون سازش کی ہے؟

گول کھپا: بالکل نہیں مجھے خبر نہیں۔

جواب: ناکام رہی تو سازش، کامیاب ہو جاتے تو انقلابی عمل۔ اور ہاں سیئے میں "لڑکوں" نہیں ہوں۔ لڑکوں کا باپ ہوں۔ بال بچوں والوں کو پڑھاتا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس ہنس دیا: تناؤ میں کچھ ڈھیل پڑی۔

اور دو چار سوال ہوئے چٹ پٹے سے۔ گول کھپے کی آڑ نے بہتیرے اشارے کئے کہ یوں نہیں۔ یوں۔ لیکن زندگی میں اس سے پہلے اور اس کے بعد جب بھی ایسے فیصلہ کن مرحلے آئے۔ اور آئے تو بہتیرے۔ تب اندرون میں کسی نے دستک دی اور کہا، لا داہنا ہاتھ۔ یہ لے نجات، لا بایاں ہاتھ، یہ لے بلائیں اور آفات۔ اب جو مٹھی چاہے، کھول۔ تجھے اختیار ہے۔ میں بائیں مٹھی کھولتا رہا ہوں (سوائے دو موقعوں کے)

اس دن بھی یہی کیا۔ رات کو حوالات، دوسرے دن بلند شہر جیل۔

صاف ستھری جیل تھی۔ مجھے تو بڑی پسند آئی۔ ڈھائی سو کانگریسی تھے اور ہائے افسوس کہ ان میں صرف ایک مسلمان ارتضیٰ علی (ڈبائی کے وکیل)۔ میں تو یونہی جا پہنچا۔ کانگریس کا ممبر تک نہیں تھا۔ نہ اس کے بعد بنا۔

کہیں بھی اتنے سارے آدمی ایک درجے میں سرفروش نہیں ہوتے۔ سچا نو پرتاپ سنگھ کے والد بزرگوار ٹوڈر سنگھ تھے جنھیں میں چھوٹتے ہی شیخ جی کہنے لگا۔ وہ دو دن میں مجھ پر شفقت فرمانے لگے۔ دو سادھو تھے سبزی اور دودھ پر گزارا کرنے والے۔ انھوں نے اپنے حصے کا ایک ایک کیلا کھلانا شروع کر دیا۔ ٹھاکر لبھد رسنگھ تھے (جہاں بھی ہوں، خدا انھیں خوش رکھے) آریہ سماج کا لٹریچر لے آئے۔ سوامی دویکانند سے، ان کے کام سے تعارف کرایا۔ دیوا گری پڑھانے بیٹھ گئے۔ میرے کھانے پینے کا خیال رکھنے لگے۔ بنارسی داس تھے (انشورنس ایجنٹ) جو کافی عرصے تک یوپی کے منسٹر رہے اور اب اسپیکر ہیں۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ کم عقل نہ کانگریسی، نہ سوشلسٹ، پھر اسے کیوں ہمارے ساتھ رکھا ہے، کوئی خاص نیت تو نہیں؟

دن بھر تو پروگرام کی باقاعدگی کی بدولت گزر جاتا۔ رات ستانے آتی۔ گھر والوں کو روٹی کون دے گا؟ ایک روز ڈپٹی جیلر نے، کہ خاص قدر دانی کرنے لگا تھا، بلا بھیجا۔ کہا۔ آپ کی والدہ ابھی روتی ہوئی گئی ہیں۔ صبح سے رو رہی تھیں گیٹ پر۔ میں نے کہا: ہندوستانی شیعہ پر سوگواری طاری ہے تیرہ سو برس سے۔ اس نے حسین کی عزا کو عمر بھر کا عزا خانہ بنا رکھا ہے۔

انھیں یہ بدکلامی بری لگی۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا مجھے بھی بری لگتی۔

پھر میں نے کہا: ڈپٹی صاحب۔ خدا را بتلایئے۔ مجھے شرم نہ آئے گی کہ یہاں دو سو سے اوپر آدمی گرفتار ہیں۔ نوجوان کچھ پچاس ساٹھ تو ہوں گے ہی۔ کسی کی ماں جیل کے پھاٹک پر رونے نہیں آتی۔ سنسکرت پاٹھ شالہ کا جو لڑکا میرے ساتھ پکڑ کر لایا گیا ہے اس کی ماں ہمت بندھانے آئی تھی ابھی چار دن پہلے۔ ڈپٹی صاحب، آپ سید زادے ہیں۔ کیا یہی تعلیم ملتی ہے آپ کو سید سجاد کی اسیری سے؟ آپ کو عادت ہو گئی حضرت زینب اور شہربانو کو بین کرتے اور سینہ پیٹتے دیکھنے کی۔ لکھنوی مرثیے نے اس سوگوارانہ

عادت کو اور مقبول عام کر دیا........ خدا جانے کیا کیا کہا اور چلا آیا۔

ارتضٰی علی بڑے خوش وقت، مرنجاں مرنج، گول گپّا آدمی تھے۔ مگر اندر سے سنجیدہ۔ پوچھا۔ کیا سوچتے ہو؟

"سوچنا کیا ہے حضرت۔ اگر ہماری مائیں اتنی بے حوصلہ ہیں۔ اگر متوسط طبقے کے مسلمانوں میں سے اتنی بڑی سیاسی تحریک کے میدان میں سو پچاس آدمی بھی ایک ضلع سے نہیں نکل سکتے تو زندگی کی دوڑ میں ان کا مقام ظاہر ہے۔ کل جب ملک آزاد ہو گا (اس کی آزادی کو مسٹر جناح روکیں گے نہیں) تو یہ بے حس تماشائی کہاں پاؤں ٹکائیں گے۔ یہ سوچتا ہوں۔ وہ بولے " واہ شُم پیتی۔ تم سوچ بھی سکتے ہو؟" "شُم پیتی" ان کا محبوب لفظ تھا جس میں ہر اچھے بُرے معنی سما جاتے تھے۔ وہ خود بھی کچھ کم "شُم پیتی" نہیں تھے۔

ایک دن جیل میں کسی معاملے پر ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس کے پَرے دَھپ دھپ کرتے لاٹھیاں تانے آپہنچے۔ ہم سب C اور B کلاس والے بیرک کے قاعدے توڑ تاڑ، گھیرا بنا کر پرارتھنا کے لئے کھڑے ہو گئے۔

جھنڈا اونچا رہے ہمارا
وشو وجئی ترنگا پیارا

ایس پی مشہور پولیس افسر رشید الظفر اس دستے کے کماندار تھے۔ انھوں نے حکم دیا "DIPERSE!" کوئی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ انھوں نے پھر حکم دیا۔ "گانا بند کیجئے!" کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ انھوں نے لاٹھی چارج اور فائرنگ کی دھمکی دی تو قیدیوں میں سے کسی سنگھ صاحب (ایم ایل اے) نے مہرِ خاموشی توڑی۔ اور چیک کر کہا: مسٹر ایس پی، یہ ہماری کانگریسیوں کی عبادت ہے، پوجا ہے۔ کیا آپ اپنی نماز بیچ ہی سے توڑ دیں گے۔؟

جوں توں کر کے قصّہ رفع دفع ہوا۔ پولیس جیلر وغیرہ کو خفیہ ہدایات دے کر چل دی۔

اس کا جانا تھا کہ سید ارتضٰی علی نوں فاں کرتے اُن ایم ایل اے کے سامنے پہنچے "یہ سیاسی پرارتھنا ہے۔ یہ ایک پولٹکل پارٹی کا گانا ہے۔ اسے نماز سے کیا نسبت؟ آپ نے نماز کا نام کیوں لیا۔ نماز میرا دین ایمان ہے۔ مسٹر سنگھ، میں اس کے لئے جان دے سکتا ہوں۔ ترنگے جھنڈے والے گانے کے لئے جان نہیں دوں گا۔

بڑوں بوڑھوں نے بمشکل انھیں ٹھنڈا کیا اور ایم ایل اے صاحب نے اپنے الفاظ واپس لیے۔ لیکن میرے سینے کی تختی پر سیاہ صرف کی پوری ایک گانٹھ اور بڑھ گئی۔ داغ پڑا رہ گیا۔

مگر ابھی دو ایک دھماکے ہونے باقی تھے۔

صبح کا وقت۔ ستمبر کے آخری دنوں کی نرم دھوپ۔ ایک تھے پیارے لال۔ سب لوگ انھیں نفاست کی نسبت سے پیارے لال نیفسی کہتے تھے۔ نیفسی کے گھر سے شہد کی بوتل آئی ہوئی تھی، وہ انھوں نے دھوپ میں رکھ دی۔ پھر اندر گئے شیو کا سامان لائے۔ وہ بھی ایک چوکی پر لگا دیا۔ پھر کہیں چل دیے۔

میں نے شیو کرتے لوگوں کو دیکھا تھا، تب تک خود شیو کی نہ ضرورت سمجھی تھی، نہ کیا تھا۔ اس دن جی میں کیا آئی، کہ نیفسی

جی کا سیفٹی ریزر لگا کر خود اپنے گال چھیلنے بیٹھ گیا۔ ٹھوڑی سے لہو ٹپکنے لگا۔ کسی نے مشورہ دیا۔ منہ دھو کر شہد لگاؤ۔ جلدی جلدی چھپکے مارے، اُنھی کی شہد کی بوتل، ہاک نکال کر سونگھی اور ابھی زخموں پر "مرہم" لگانے ہی پایا تھا کہ فینسی نمودار ہو گئے۔ دیکھا۔ سکتے میں آگئے۔ اس وقت انھوں نے نہ شیو کیا، نہ بوتل بند کی۔ سرک گئے۔

جب میدان خالی پایا، آئے اور آہستہ سے بوتل مع شہد لے جا کر غلاظت کے ڈھیر کی آڑ میں ڈال آئے۔ دوسرے دن سے اُن کے چہرے پر داڑھی اور میرے باطن میں جھاڑی اُگنے لگی۔ یعنی مرنے جینے کا ساتھ اور اثنا فاصلہ! "اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"۔ دن کے ہنگامے میں، ظاہر ہے کہ نوجوان زیادہ پُرشور اور نمایاں تھے۔ بیرکیں بند ہونے کے بعد باہر سے وارڈر، دو پولیس والے اور ایک افسر لالٹین اور سنگین لئے بھڑاق سے اندر آئے۔ گالیوں کی طرح نام منہ سے نکالے۔ ایک، دو، تین چار ــ کُل نو نام تھے۔ فوں نام اِس جان زار کا۔ بجلی آؤ تا ہو ایک ایک دو دو کو نکال کر تاریک احاطے میں لے جاتے ذرا دیر بعد خوفناک آہوں اور کراہوں کی دلخراش صداؤں سے پتہ چلتا کہ درخت میں باندھ کر انتے کوڑے لگائے گئے ہیں۔ رات کے ہولناک سناٹے کو کاٹتی ہوئی چیخیں ــ اور پھر سناٹا۔ یعنی قیدی بے ہوش۔ سب سے زیادہ کوڑے بنارسی داس کے پڑے۔ اس سے پہلے کہ میرے باہر نکالے جانے کی باری آئے۔ ایک اور وارڈر دوڑتا ہوا آیا اور نام پکارنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ کھسر پھسر کی۔ میرے نام سے ملتا جلتا ہردوار کے ایک نیک طینت، فرشتہ سیرت سادھو کا نام تھا۔ پچھلے وارڈر نے وہ نام پکار دیا۔ سادھو جی دست بستہ نکالے گئے۔ جب بیرک کے احاطے میں بندھ کر پہلے بھرپور کوڑے پر انھوں نے جان گداز آہ بھری تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس لمحے کی پوری سوانح عمری اپنے ڈرامائی کانفلیکٹ کے ساتھ میرے حافظے میں آج تک لرزتی ہے۔ اور میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ کوڑے کا نشانہ غلط پڑنے، اپنی کھال بچ جانے پر وہ اطمینان کی لرزش تھی یا شرم و ذلت کا کرنٹ ــ یا دونوں۔ دوسرے دن راز کھلا کہ وہ ڈپٹی جیلر، جو میری زبان دانی کے قدرداں اور اماں کے آنسوؤں سے دل گرفتہ تھے، انھوں نے آنِ واحد میں بیک جنبشِ قلم قربانی کے بکرے بدل دیئے تھے۔ گرہ پر گرہ پڑتی چلی گئی۔ اور جب ان گانٹھوں کو کھلنا نصیب نہ ہوا تو کسی تیز دھار کے جھٹکے کی طلب بڑھنے لگی جو ایک وار میں ساری گانٹھیں کاٹ ڈالے۔

کیونزم ــ مارکسی نظریہ۔ کہاں ملے۔ کیسے ملے۔ اور کیا خبر وہاں بھی جھول جھپٹ ہو۔ جب مسجدوں کے حجروں میں بے دردی اور بے دینی کا یہ حال ہے تو بالشویک یوں بھی کسی دین کو نہیں مانتے۔ اُن سے کیا ملنا ہے۔ پھر بھی جانا جائے۔ بتا جائے .....

(۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک)

ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز ست!

(باقی پھر)

۴

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.

107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضاؔ
مدیر
صابر دتّ